Volume 02, Issue 03,
October-December 2024
PP: 228-235
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

منو بھائی کے ڈراموں میں سماجی حقیقت نگاری

Social Realism in the Dramas of Munū Bhā'ī

Umar Farooq[1], Dr. Muhammad Salman Bhatti [2]

Article History

Received
02-12-2024

Accepted
21-12-2024

Published
30-12-2024

Indexing

Abstract

Urdu drama stands apart from other forms of prose due to its unique narrative style and structural techniques. Among these, dialogue writing holds a central place. Munū Bhā'ī is a distinguished figure in Urdu drama, renowned for his insightful portrayal of social realities. His works address a wide spectrum of societal themes, including political, social, religious, and satirical elements, making his dramas a reflection of contemporary issues.

A defining feature of Munū Bhā'ī's dramas is the vivid contrast between urban and rural life. He meticulously illustrates the complexities of city life, highlighting its chaos, struggles, and alienation, while simultaneously portraying the simplicity, innocence, and sincerity of village existence. His dramas often explore how modernization and urbanization impact human relationships and traditional values. Another significant aspect of his work is his critique of the feudal system, shedding light on its deep-rooted influence on socio-economic structures. His narratives expose the exploitation, oppression, and class disparities entrenched in society, making his dramas both thought-provoking and socially relevant.

Through realistic character portrayals and compelling storytelling, Munū Bhā'ī brings forward the emotions, struggles, and aspirations of the common people. His works serve not only as a mirror to society but also as a medium of resistance against injustice. His mastery of dialogue and keen observation of human nature make his contributions to Urdu drama unparalleled, cementing his legacy as one of the most influential playwrights in Urdu literature.

Keywords:

Urdu Drama, Munū Bhā'ī, Social Realism, Urban Life, Rural Life, Social System, Satire, Political Themes, Societal Issues, Dialogue Writing.

[1]*PhD Scholar, Department of Urdu, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lahore. farooqu660@gmail.com*

[2]*Associate Professor, Head of the Urdu Department, Division of Islamic and Oriental Learning, University of Education, Lahore. msalman@ue.edu.pk*

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

اُردو ڈرامانے برصغیر کے اندر اور باہر وقوع پذیر ہونے والی تمام سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فکری تبدیلیوں کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ اسٹیج اور ریڈیائی ڈراما کے ساتھ ساتھ ٹی وی ڈرامانے بھی خاصا فروغ حاصل کیا۔ اس حوالے سے ظہورالدین کہتے ہیں:

"ٹی وی کے پھیلاؤ نے اردو ڈرامے کو نئی سمتوں کی طرف قدم بڑھانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔[1]

تھیٹر، فلم اور ریڈیو نے ڈراما پر ہمہ جہت اثرات مرتب کیے۔ 1924ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کی آمد نے اُردو ڈراما کی تاریخ کو ایک قابل فخر موڑ دیا اور یہ صنف ایک لازوال فن کی صورت اختیار کر کے اصناف ادب میں سب سے مقبول اور مضبوط ہو گئی۔ ابتداء میں پی ٹی وی کو ماخوذ کہانیوں کا سہارا لینا پڑا جو بہت سی مقامی اور مغربی زبانوں سے ماخوذ تھیں۔

منو بھائی کا نام اُردو ڈراما نگاری میں کسی تعارف کا متاج نہیں۔ آپ کا شمار پاکستان کے ان ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ڈراما کو ایک تحریک کی شکل عطاء کی اور اسے پاکستانی تہذیب کا حصہ بنایا۔ نئے ڈراما نگاروں کے لیے ان کا فن مشعل راہ ہے۔ انہوں نے ان موضوعات پر قلم اُٹھایا، جس کی معاشرہ کو ضرورت تھی۔ سنجیدگی کے ساتھ مزاح اور مزاح کے ساتھ سنجیدگی کو منو بھائی نے یوں جوڑ دیا ہے کہ دولخت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

منو بھائی کا شمار ان ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے، جن سے بیک وقت دو نسلیں اور دو زمانے واقف و آشنا ہیں۔[2]

"سونا چاندی" ڈراما منو بھائی کا شاہکار ہے، جس نے نا صرف منو بھائی کو بلکہ پاکستان ٹیلی ویژن کو بھی شہرت عطاء کی۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر ڈراموں میں پلیٹ فارم، جھوک سیال، باؤٹرین، ابابیل، چھوٹے، یہ کہانی نہیں ہے، دشت، مسرت، ساحل، نغمے کا سفر، پے سے پہاڑ، وہ آنکھیں، سیاسی ورکشاپ اور دیواریں زیادہ نمایاں ہیں، جن میں اس نے معاشرہ کے ہر ایک موضوع پہ قلم اُٹھایا ہے۔

ڈراما سونا چاندی کے علاوہ طویل دورانیے کے کھیل "خوبصورت" اور "گمشدہ" آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ سلسلہ وار کھیل "آشیانہ" میں وہ خاندانی اقدار سے جڑے مسائل کو سامنے لاتے ہیں تو مشہور ڈراما "دشت" کے ذریعے انہوں نے بلوچستان کی صحرائی ثقافت کو اپنے قلم کی زینت بنایا ہے۔ اس کے علاوہ منو بھائی نے مشہور ڈراما "جھوک سیال" کو ڈرامائی تشکیل بھی دی۔ یہ ڈراما دیہاتی منظر نگاری اور کردار نگاری کے حوالے سے ایک سنگ میل گردانا جاتا ہے۔

ڈراما "سونا چاندی" جب پی ٹی وی کی زینت بنا تو چینل کو بے حد پذیرائی ملی۔ یہ ڈراما 1983ء میں لاہور سے نشر کیا گیا، جس میں گاؤں سے شہر میں آئے دو سادہ لوح میاں بیوی کی کہانی نہایت ہی دلچسپ طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ اس ڈراما میں شہر میں بسنے والوں کو یہ احساس دلایا کہ شہر کی پر تصنع زندگی سے گاؤں کا سادہ پن کس طرح اور کتنا بہتر ہے۔ گاؤں کے لوگ کتنے سادہ اور مخلص ہیں، ان دو کرداروں کے ذریعے بڑے خوبصورت انداز میں دکھایا گیا ہے۔ منو بھائی خود اس ڈراما کے بارے میں اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> "اس کھیل میں پاکستان ٹیلی ویژن کے ذریعے ملک کی اس آبادی سے رابطہ قائم کیا ہے، جو دیہات اور شہروں کے درمیان بکھری ہوئی ہے۔ دیہات چھوڑ کر شہروں کی طرف آ رہی ہے۔ نا دیہی رہی ہے اور نا ہی شہری بن سکی ہے۔ ملک کی اس آبادی کے مسائل، ان پاکستانیوں کے مسائل سے مطابقت رکھتے ہیں، جو روزگار کی تلاش میں غیر ممالک میں مقیم ہیں اور دو مختلف معاشرتی مسائل سے دوچار ہیں۔"[3]

"دشت" ڈراما میں دو قبائل (مہدی اور سالاری) کی المناک تصویر دکھائی گئی ہے۔ دونوں قبائل سرداری کے بل بوتے پہ ایک دوسرے پر جو ظلم و ستم کرتے ہیں یا دونوں کے درمیان جو تصادم ہوتا ہے، اسے دکھایا گیا ہے۔ یہ ڈراما بلوچ قبائلی زندگی کا مکمل عکاس ہے، جو شاہ تاج اور بالاچ کی محبت بھری زندگی سے شروع ہو کر بلوچی زندگی کے مختلف مسائل سامنے لاتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ "آشیانہ" میں خاندانی

اقدار کو موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا گیا کہ خوشیاں، دھن دولت اور آسائشوں سے نہیں بلکہ خوشی کا لطف تمام اہل خانہ سے مل کر ہی آتا ہے۔ڈراما میں واضح کیا گیا کہ گاؤں میں بسنے والوں کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے ہیں،وہ ایک دوسرے کی فکر میں جان تک لگا دیتے ہیں، مگر شہر کی مصروف زندگی میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں بنتا،انسان کو اپنی جنگ آپ ہی لڑنا پڑتی ہے۔ڈراما سیریل "باؤٹرین" درحقیقت ایسے ملازمین کی گھریلو زندگی کی کہانی ہے،جو روزانہ ٹرین کے ذریعے سیالکوٹ سے لاہور آتے ہیں یا پھر روزگار اور کاروبار کے سلسلے میں سفر اختیار کرتے ہیں۔باؤٹرین کے مسافر ایک دوسرے کے بہت مددگار ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں کچھ مسافر ایسے ہوتے تھے، جنہوں نے روز سفر کرنا ہوتا تھا اور کچھ اپنی کہانیوں کے بعد رخصت ہو جاتے تھے۔اس ڈراما کا مرکزی کردار قاضی جی کا ہے،جو کسی بھی مسافر کے ساتھ ہونے والے ہر ایک دکھ درد میں اس کی مدد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ڈراما میں دیہات میں بسنے والوں بالخصوص ان خواتین کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو اپنے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مسئلے کے پیچھے کسی جادو اور تعویز کو حقیقت جانتی ہیں اور پھر اپنی تمام تر کمائی بڑے آرام سے کسی نقلی پیر کے ہاتھوں برباد کر دیتی ہیں۔اس ڈراما میں استانی جی کے کردار کے ذریعے بہت سی خواتین کی ایسی ہی بدفعلیوں سے پردہ اُٹھایا جاتا ہے۔

ڈراما "یہ بچی کس کی ہے" ہمارے معاشرتی نظام کی کہانی ہے، جس میں والدین اپنی اولاد کو جنم تو دیتے ہیں مگر ان کو پیار، وقت اور حقوق دینے سے قاصر رہتے ہیں۔اس پیار اور محبت کی تلاش میں بچے باہر کا رخ کرتے ہیں اور زمانہ انہیں کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔کہانی کا مرکزی کردار کرن نامی ایک بچی ہے، جبکہ ضمنی کرداروں میں فضل، اس کی بیوی ثروت، نوکر، بشیر، کرن کی ماں بانو، باپ قادر، حاجی صاحب، قاضی صاحب اور تھانے دار شامل ہیں۔بچی کے گم ہو جانے کے بعد جب اس کا باپ (قادر) بیوی سے تکرار کرتا ہے کہ تو نے اس کے ساتھ فرصت کی کتنی گھڑیاں گزاری ہیں اور تمہارے پاس کرن کے لیے وقت میسر نہیں تو وہ یوں جواب دیتی ہے:

"نہیں میرے پاس بس یہی ہے کہ اس کے لیے دو ملازم رکھے ہوئے ہیں۔"[4]

ڈراما "آدھے چہرے" ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے، جہاں ہر شخص ہی اپنا آدھا چہرہ لیے ہوئے پھر رہا ہے۔وہ ایک تشخص اور پہچان کی تکمیل دوسرے لوگوں کی نظروں میں مکمل کرنا تو درکنار، خود سے بھی آنکھیں چرا کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔کسی بھی مسئلے سے فرار، اس مسئلے کا مکمل طور پر حل نہیں۔حقیقت سے فرار انسان کو دور تو لے جا سکتا ہے مگر اس شے کے جذبات کو اس کے دل سے مکمل طور پر کا فور نہیں کر سکتا۔منو بھائی کے اس ڈرامے کا بھی بنیادی موضوع یہی ہے کہ کوئی چہرہ بھی آدھا نہیں رہنا چاہیے۔آدھے چہرے تو نصف حقیقت ہوا کرتے ہیں جو کہ جھوٹ ہوتا ہے۔

واہمہ دراصل ایک ایسی کیفیت ہے جس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔وہم اگر ایک بار انسان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو جائے تو یہ تندرست کو ذہنی مریض بنا دیتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ جو سوچتا ہے یا جس خوف کو وقوع پذیر ہونے سے قبل اندر جگہ دیتا ہے وہ حقیقت میں بھی اس کے ساتھ کبھی نہ کبھی واقع ضرور ہو جاتا ہے۔بشریٰ کی زندگی میں بھی یہ بڑے واقعات محض اتفاقات زندگی کے سوا کچھ نہ تھے، مگر اس نے ان واقعات کو زندگی میں اس قدر اہمیت دے دی کہ جس نے صرف اپنے آپ سے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس سے متنفر کر دیا۔وہ اپنے گھر میں اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ تنہا رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔کوئی بھی اس سے کپڑے نہ سلواتا کیونکہ ان کا توہم پرستی میں یہ عقیدہ ہو چکا تھا۔بشریٰ سے کسی طرح کا واسطہ تعلق ہونا حتیٰ کہ اسے یاد کرنا بھی کسی بڑی قیامت اور خطرے سے کم نہیں اور اس سے ان کے معمولاتِ زندگی میں بگاڑ پیدا ہوتا گیا اور وہ تنہا رہنے پر مجبور ہو گئی۔جیتے جی بھی وہ موت کی گھاٹی میں دن رات سانس لینے لگی۔اس کی ماں واحد تھی جو چھپ کر اس کا سہارا بنی۔وہ محلے اور شہر کے دوسرے درزیوں سے کٹے ہوئے کپڑے لے کر آتی اور بشریٰ ان کو سی کر اپنی ماں ہی کے ہاتھوں درزیوں کو بھیجتی اور اس سے اپنا گزر بسر کرتی۔دوسری طرف سلیم کے والد اگرچہ بشریٰ کے رشتے پر رضامند نہیں ہوتے مگر سلیم کا دل علینہ کی بجائے بشریٰ کے

رشتے پر ہی اطمینان ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا علینہ بھی بشریٰ کا سلیم کو سہارا بنانے کی مکمل طور پر حمایت کرتی ہے۔ علینہ معاشرے کے نصف چہرے کو مکمل کرنے پہ یقین رکھتی ہے۔

"ہم سب آدھے چہروں کے لوگ ہیں۔ اپنے مفاد اور مقصد کا چہرہ دیکھتے ہیں اور دوسروں کے مفاد اور مقصد کا چہرہ نہیں دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ جو چہرہ ہمیں دکھائی دے رہا ہے وہی مکمل چہرہ ہے۔"[5]

ڈراما "پتھر" گاؤں کے ایک ایسے کردار کی کہانی ہے، جسے اس کی ضد، انانیت، مفاد اور لالچ، اس قدر پتھر بنا دیتے ہیں کہ وہ بیوی کے جذبے اور بیٹی کے ارمان سمجھنے سے بھی قاصر ہو جاتا ہے۔ زمینوں کے روگ کو اپنی شخصیت کے لالچ میں اتنا طول دیتا ہے کہ وہ اس کی بیوی کے سوگ میں بدل جاتا ہے۔ مرکزی کردار لالچی اور انا پرست تایا برکت کا ہے۔ منو بھائی عمیق مشاہدے اور تجربے کے مالک ہیں۔ انہوں نے یہاں سے اس کا دوسرا رخ بھی دکھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ شہر میں اگر تیزی، مادیت پرستی اور نفسا نفسی کا عالم ہے تو دیہات میں بھی زمینیں اور جاگیریں نفرتوں کا بیج بو کر خود کو انسانی جانوں کے خون سے سیر اب کرتی ہیں۔ نفرت، عداوت، لالچ اور انتقام کی یہ فصل ایک ہی بار کٹ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی نمائش اور کٹاؤ کا عمل نسل در نسل جاری رہتا ہے۔

"آپ نے کھیتوں کا صرف سبزہ دیکھا ہے۔ میں نے ان کھیتوں میں انسانی خون بہتے دیکھا ہے۔ آپ نے اُجلی چاندنی دیکھی ہے۔ میں نے اس چاندنی میں آہوں کا دھواں بھی دیکھا ہے۔ آپ کو دیہات میں محبت، خلوص اور بھائی چارہ دکھائی دیا مگر میں نے بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا ہے۔ ایسے ہی ایک دشمنی نے میرے ہاتھ سے ہل کی ہتھی چھین کر مجھے۔۔۔۔۔ یہ قینچی پکڑا دی ہے۔"[6]

ڈراما "چھوٹے" میں ان بچوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو پڑھنے لکھنے کی بجائے کمسنی میں ہی کاروبار کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ ڈراما نگار نے بچوں کے محنت مزدوری کرنے کی دو بڑی وجوہات بیان کی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی وجہ تعلیم کی کمی اور چھوٹے علاقوں میں تعلیمی اداروں کا نہ ہونا ہے۔ چونکہ تعلیمی ادارے نہیں ہوتے اس لیے چھوٹے بچوں کو ان کے بچپن میں ہی کام پہ لگا دیا جاتا ہے، تاکہ بروقت پیسے کمانے کے قابل ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ان کو بری صحبت سے بچایا جا سکے اور ان کے وقت کو صحیح جگہ استعمال کیا جا سکے۔ اس لیے منو بھائی نے اس ڈرامے میں تعلیم کی ضرورت و اہمیت پہ بات کی ہے اور جتنی ضرورت و اہمیت تعلیم کی ہے اتنی ضرورت و اہمیت تعلیمی اداروں کی بھی ہے۔ کیونکہ تعلیم کا وجود تعلیمی اداروں سے ہی ہے۔ اس کے علاوہ بستی میں رہنے والوں کی تعلیم پہ سیر حاصل گفتگو کی ہے تاکہ ذہن سازی کی جا سکے۔ اس طرح جن دکانوں پر جو بچے کام کرتے ہیں، انہیں بھی بچوں کی تعلیم کے لیے راضی کرنا بلکہ ان مزدور بچوں کی فیس ادا کرنے کی بھی تجویز بھی دی ہے۔ بستی کے بزرگ "تایا جی" کی زبانی منو بھائی نے ایسے مزدور بچوں کو تعلیم نہ دلوانے کا قصور صرف غریب والدین کو ہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک ان کا قصوروار پورا معاشرہ ہے۔

"تایا جی: ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں اور ان بچوں میں تمیز کرتے ہیں۔ بلکہ بچے ہمارے مستقبل کی سانجھی فصلیں ہیں۔ ان فصلوں کی آبیاری اور دیکھ بھال ہمارا مشترکہ فرض ہے۔ چنانچہ آپ سب لوگوں کو اپنی دکانوں اور ورکشاپوں میں کام کرنے والے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا پڑے گا۔"[7]

ڈراما "حوالدار کا ہوٹل" میں عورت ذات کی نفسیات بیان کی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ کس طرح عورت دوسری عورت کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ ایک پرانی روایت رہی ہے کہ کسی عورت کا خود ہی اپنی چیز چھپا کر دوسری عورت پر چوری کا الزام لگا دینا، بھلے بعد میں حقیقت سامنے آجائے۔ اس ڈراما میں جعلی پیر اور اس کے ہاتھوں بے وقوف بننے والی عورتوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح جعلی پیروں نے

اپنے لیے خواتین رکھی ہوتی ہیں جو ان کو آنے والے مریدوں کے دکھ درد پہلے سے ہی بتاتی ہیں اور پھر وہ اسی بنا پر مریدوں کے حال حوال ان کو جب بتاتے ہیں تو ان کا یقین اور بھی ان پہ پکا ہو جاتا ہے۔

"ثریا صبح منہ دھونے کے لیے زیور اتارتی ہے اور جب میک اپ کے بعد دوبارہ پہننے لگتی ہے تو اس میں سے سونے کی انگوٹھی غائب ہوتی ہے۔ پہلے شکوک و شبہات میں اور پھر "بابے لوٹے والا" کے عمل کے نتیجے میں چوری کا الزام شادو پر لگ جاتا ہے۔"[8]

پرانے خوددار لوگوں کو اپنی عزت نفس اس قدر پیاری ہوتی تھی کہ وہ اس کے تحفظ و بحالی کے لیے اپنی جان و مال بھی داؤ پر لگا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انگوٹھی کے بدلے ثریا زیورات کا ڈھیر ان کے سامنے پیش کر کے پھر بھی مہمان کی تکریم میں عاجزی و انکساری کا اظہار کرتی ہیں۔ مگر "بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں" کی ضرب المثل کے مصداق مطلوبہ انگوٹھی ثریا کے اپنے بھائی منصور سے برآمد ہوتی ہے۔ جب منصور واپسی پر گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے جیب سے رومال نکال کر اپنی عینک صاف کرنے لگتا ہے تو انگوٹھی نیچے گر جاتی ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سے ایک عورت، دوسری عورت پر الزام لگاتی ہے اور پھر جعلی پیر کس طرح ایسے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ڈراما "خوبصورت" خوبصورتی کے معیارات پر بہت عمدہ طریقے سے بات کی گئی ہے۔ ڈراما نگار موضوع کا بنیادی نقطہ یہ سامنے لاتے ہیں کہ خوبصورتی شے میں نہیں، بلکہ نظر میں ہوتی ہے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خوبصورتی اور بدصورتی کا تعین کرتی ہیں۔ خوبصورتی نگاہوں کی نہیں، بلکہ نگاہیں خوبصورتی کی محتاج ہوا کرتی ہیں۔ پھول جو کہ خوبصورتی کا مرقع ہوا کرتے ہیں، یہ نا تو لوگوں کی نظروں میں پسند کیے جانے پر خوش ہوتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کی ناپسندیدگی دیکھ کر مرجھاتے ہیں۔ پھولوں میں اصل شے ان کی خوبصورتی اور خوش بو کے علاوہ ہوتی ہے اور وہ ہے اس کی تاثیر۔ ڈراما "خوب گزرے گی" میں بھی دو ایسے بوڑھوں کی کہانی ہے جن کا عمر رسیدہ ہونے اور الگ ماحول و مزاج رکھنے کی بنا پر، نئی نسل سے نبھا نہیں ہو پاتا اور دونوں اپنا اپنا گھر چھوڑ کر ہوٹل میں کرائے کے مکان میں مقیم ہیں۔ مگر دیہات میں لوگ بڑے بزرگوں کی قدر بے جا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان دونوں کی بلاوجہ بحث کے باوجود بھی پورا گاوں ان کی عزت کرتا ہے۔ پنجابی ڈراما "چاچے داپتر" میں ٹھیکیدار کی ہیرا پھیریوں کو بے نقاب کر کے ایک اہم معاشرتی برائی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ٹھیکیدار کس طرح مزدوروں کا ایک طرف حق مارتے ہیں اور دوسری طرف ان کو ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ بے روزگاری کے پیش نظر مزدور طبقہ ان کا ہر ظلم برداشت کرتا ہے۔

کاروبار ہو یا پھر فنون لطیفہ، ہر ایک موضوع پہ منو بھائی نے قلم اٹھایا ہے۔ کاروبار اور بزنس کے حوالے سے ان کا ڈراما "مسرت" سیفی کے ظاہری کردار میں ہمارے ایک ایسے معاشرے کے کردار کی عکاسی کرتا ہے جو ادب اور فنون لطیفہ میں بھی اپنی دلچسپی رکھتا ہے اور کاروبار سے بھی الگ ہونا، اسے گوارا نہیں۔ زیرِ نظر ڈرامے کی کہانی ادب و فن اور کاروباری پیشہ میں کھوئے ہوئے انسان کی ہے، جو نئی دنیا کی دریافت کے ذریعہ مسرت کی تلاش میں مصروف ہے۔ ظاہری کردار اس کا ایک بزنس مین کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنایہ کردار حقیقی نہیں بلکہ محض اوڑھا ہوا کردار معلوم ہوتا ہے۔

"سیفی: (صرف آواز) میں اپنے اس موجودہ کردار کو فیل نہیں کر رہا۔ میں اس کریکٹر میں لائیو نہیں کر رہا۔ میں نے یہ کردار محض اوڑھ رکھا ہے۔ میں ادب اور فن کی دنیا سے کٹ گیا ہوں۔ اپنے آپ سے دور ہو گیا ہوں۔ یہ دوری میری مسرت کی راہ میں حائل ہو گئی ہے۔"[9]

منو بھائی کا ایک اور ڈراما "نغمے کا سفر" بھی اسی موضوع پہ ہے جو موسیقی کی نوحہ گری اور اس کے ماتم پر مبنی ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب علم و ادب، شاعری اور فنون لطیفہ و موسیقی کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔ دکنی بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے تو علمِ موسیقی پر مبنی سترہ راگوں پر ایک

کتاب "نورس" بھی تخلیق کی۔ اس کے بعد کے بادشاہی دورِ حکومت میں عہد بہ عہد ان امور کی سرپرستی تو جاری رہی مگر یہ روبہ زوال ہوتی چلی گئی۔ زیرِ نظر ڈرامے میں منو بھائی اس نغمے و موسیقی کے تنزلاتی نظام پر شکوہ کناں نظر آتے ہیں۔ کوئی اسے بے ادبی، فحاشی تصور کرتا ہے تو کوئی اسے بے حیائی کا سب سے اساسی مجرم گردانتا ہے۔ کسی کی علمِ موسیقی اور نغمے میں دلچسپی نہیں تو کوئی مصروفیت کے اس دور میں اس قدر مصروف ہو چکا ہے کہ نغمہ و گائیکی سننے کا شوق نہیں رکھتا اور نا ہی اس کے پاس وقت ہے۔ ہمارا فن کار ایسے نظام میں ان کا منہ تکتے ہوئے علم و فن اور اپنی فن کاری و گیت کاری سے منہ موڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"آپ جانتے ہیں کہ اس محلے میں دس مکانات ہیں۔

بشیر: جی ماشاءاللہ

چوہدری: آپ کے علاوہ نو اور کرایہ دار ہیں۔

بشیر: جی جانتا ہوں۔

چوہدری: وہ سب معززین ہیں۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنا دھندا جاری رکھنا ہے تو بہتر ہے کہ آپ کسی مناسب اور موزوں جگہ پر کوئی مکان کرایہ پر لے لیں۔"[10]

خیالاتی دنیا میں رہتے رہتے انسان کہیں کا کہیں چلا جاتا ہے، مگر خیالات کبھی بھی حقیقت نہیں بنتے۔ انہی خیالات کے پس منظر میں منو بھائی کا ڈراما "دوسرا قدم" سامنے آتا ہے، جس میں آصف کا کردار اسی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ بیٹھا تو گاڑی میں اپنی بہن کی سہیلی یاسمین کے ساتھ تھا مگر تخیلاتی سطح پر وہ یاسمین کو عروسی لباس میں انگوٹھی پہنانے اور شادی کے تمام مناظر دیکھنے میں مصروف ہے۔ خیالات کے سمندر میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ اس کی گاڑی اچانک کسی شے سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ ہسپتال میں پہنچ کر کئی دن قومے میں رہتا ہے۔ اس لیے زندگی میں دوسرا قدم رکھنے کی سوچ و بچار کرنے سے پہلے، پہلا قدم مضبوط اور خیال سے رکھنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ڈرامے میں ڈراما نگار نے مشرقی اور مغربی تہذیب کا مختصر موازنہ بھی دکھایا ہے۔

"یاسمین: مسٹر آصف! میں نے کینیڈا کی بجائے پاکستان کے گھرانے میں آنکھ کھولی ہے اور تعلیم نے مجھے مشرقی آداب اور روایات سے انحراف کرنے پر کبھی نہیں اکسایا بلکہ ان کی اہمیت واضح کی ہے۔"[11]

کرپشن، صحافت اور سیاست دانوں پہ منو بھائی کڑی تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈراما "خاموش" کی ساری کہانی فلاح و بہبود کے نام پر چندہ اکٹھا کرنے والی تنظیموں اور بنائے گئے جعلی اداروں کے حالات کو بیان کرتی ہے۔ منو بھائی اس ڈرامے کی صورت میں ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح لوگ اپنا پیٹ پالنے کے لیے فلاح و بہبود کا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ اس کاروبار میں منافع فنڈز کی صورت میں اکٹھا ہوتا ہے۔ یہ تنظیمیں فنڈ لینے کے لیے ایک جعلی ادارہ بناتے ہیں اور مخیر حضرات سے چندے کی اپیل کرتے ہیں۔ امیر اور سخی لوگ اپنی آخرت کو سنوارنے اور اپنے سر پر آئی بلاؤں کو ٹالنے کے لیے اپنے صدقات ایسی تنظیموں کو دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کا بھی بھلا ہو جائے اور ان کی بھی دنیا و آخرت سنور جائے۔ پھر لوگوں کی فلاح و بہبود کے نام پر لیا گیا فنڈ ان تنظیموں کے سربراہوں کے ذاتی کاؤنٹس میں چلا جاتا ہے اور یوں معذوروں، یتیموں اور لاچاروں، جن کے نام پہ فنڈ جمع کیا جاتا ہے ان تک نہیں پہنچتا۔

اگرچہ ساری تنظیمیں ایسی نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کے بنائے گئے سارے ادارے جعلی ہوتے ہیں مگر یہ سچ ہے کہ کچھ تنظیمیں ہوتی بھی ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے سارے ادارے بھی جعلی نہ ہوں۔ مگر یہ تو ممکن ہے کہ ایک ادارے کے لیے جتنا فنڈ جمع کیا گیا ہے، اتنا اس ادارے کو ملتا نہ ہو اور باقی خرد برد ہو جاتا ہو۔

منو بھائی نے منصور کے کردار سے پرنٹ میڈیا میں کام کرنے والے ایسے جعلی صحافیوں کا خوب پردہ چاک کیا ہے، جن کا کام تو سچائی اور حقیقت تک پہنچ کر حق اور سچ کا ساتھ دینا ہے، ظلم اور ناانصافی کی روک تھام کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہے مگر افسوس کہ ہمارے معاشرے میں ایسے صحافی بھی ہیں جو ظالم سے ظلم چھپانے اور خاموش رہنے کی پوری پوری قیمت وصول کرتے ہیں۔

"جلال: خاک چلائیں گے مگر یاد رکھو سفارش نہیں چلے گی تو تم بھی نہیں چلو گے۔ سفارش ایک کھوٹا سکہ ہے۔ ایک جعلی کرنسی نوٹ ہے چل گیا تو چل گیا ورنہ کاغذ کا ردی ٹکڑا۔"[12]

منو بھائی کا ڈراما "رونمائی" عورت ذات کی نفسیات کو طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کپڑوں اور جوتوں کی میچنگ میں عورتیں حد درجہ حساس ہوتی ہیں۔ اس قدر حساس کے وہ صحت پر سمجھوتہ تو کر سکتی ہیں مگر اپنے کپڑوں، جوتوں اور خوبصورتی بڑھانے کے دیگر لوازمات پر نہیں۔

ساجدہ اختلاجِ قلب کی عارضہ میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے زیادہ چلنے پھرنے اور کام کرنے سے منع کیا ہے۔ مگر پھر بھی اس سے اپنی صحت کی بجائے اپنی کتاب کی رونمائی تقریب، اپنی حاضری، تعویز بنوانے اور لوگوں کے اس کتاب کے بارے میں تبصرے سننے کی فکر میں ہے۔ وہ اس تقریب کے لیے گرے رنگ کا خوبصورت سوٹ سلواتی ہے۔ میچنگ کے لیے گرے جوتے کی تلاش میں کئی بازاروں میں پھرتی ہے مگر اسے گرے رنگ کا جوتا نہیں ملتا۔ آخر وہ سفید رنگ کا جوتا خرید کے گھر لے آتی ہے۔ مگر اس جوتے سے بھی اس کی قلبی تسلی نہیں ہوتی۔ اس کا شوہر اسے مشورہ دیتا ہے کہ سفید جوتے کے ساتھ سفید ساڑی پہن لیں۔ گرے رنگ کے ساتھ سرخ جوتا بھی چلتا ہے یا پھر سرخ ساڑھی پہن لی جائے۔ مگر مسلسل نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کوئی میچ نہیں کرتا جبکہ کسی کا موسم نہیں۔ آخر جب کوئی راستہ نہیں نکلتا تو وہ کہتی ہے:

"فوٹو گرافروں سے کہیں کہ میری پوری طرح تصویر نہ اُتاریں۔ کلوز کی تصویریں اُتاریں جوتے اوائڈ کریں۔ فریم سے باہر رکھیں۔"[13]

ڈراما "سرخ ندی کے موڑ پر" گاؤں میں موجود زمینداروں کی اجارہ داری اور دیہاتی لوگوں کی سادہ لوحی کو موضوع سخن بناتا ہے۔ گاؤں میں بسنے والے لوگ اس قدر سادہ لوح اور سیدھے سادھے ہوتے ہیں کہ غیر حقیقی بات کو بھی حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ عیاری، مکاری، چالاکی اور لالچ ان سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ اسی سادہ لوح ہونے کا زمیندار اور گاؤں کے بااثر لوگ فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں توہم پرستی میں مبتلا کر کے خود اپنا مفاد نکالتے رہتے ہیں۔ اگر اس غریب اور سادہ لوح طبقے میں سے کوئی پڑھ کر یہ تمام صورتحال بدلنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کے خلاف نہ صرف سازشیں ہونے لگتی ہیں، بلکہ اس کے اپنے والدین، رشتہ دار اور گھر والے بھی اسے طرح طرح کے اوہام میں مبتلا کر کے صدیوں سے قائم تصور کے خلاف قدم نہ اٹھانے کی نصیحت کرتے ہیں۔ گاؤں کے وڈیرے اور زمیندار اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے ان کے تمام تر وسائل پر قابض ہوتے ہیں۔ پھر ان کی زمینیں کوڑیوں کے دام خرید کر ان گاؤں والوں کو گاؤں سے نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اس گاؤں اور اس کی زمینوں کے تنہا وارث و مالک بنیں۔ مگر قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب وہ نقارہ بجاتی ہے تو اس وقت ان وڈیروں کو اپنی غلطیوں اور جرائم کا احساس ہوتا ہے، جسے وہ سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈراما نگار نے

حقدار ہمارے اپنے ماحول، فضا اور معاشرے کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر علم کا چراغ بیرونی تمام راستے روشن کرے مگر اس کے اپنے اندر کا راستہ تاریک ہو تو اس کی روشنی لاحاصل اور بے سود ہے۔

"سلیم: جو کچھ میں پڑھ کے سیکھ کر آیا ہوں شہروں سے زیادہ دیہات میں اس کی ضرورت ہے۔ میں نے جو کچھ سیکھا ہے پڑھا ہے آپ کے لیے۔۔۔۔ماسی کے لیے۔۔۔۔عذرا کے لیے۔۔۔۔سکینہ کے لیے۔۔۔۔ان دیہات کے لیے سیکھا اور پڑھا ہے۔ میرے علم سے لال فقیر کی روح ناراض نہیں ہوگی اور میرے عمل سے میرے یار صادق کی روح روشن ہوگی۔"
14

حوالہ جات:

1 ظہر الدین، **جدید اردو ڈراما**، (نئی دہلی: ادارہ فکر جدید 1978ء)، ص20-

2 ابراہیم یوسف، **اُردو ڈراما کی تنقید کا جائزہ**، (نئی دہلی: نئی آواز جامعہ نگر، 1994ء)، ص76-

3 منو بھائی، **مصاحبہ**، مشمولہ: روزنامہ "جنگ"، (لاہور، 20 اپریل 1983ء)۔

4 منو بھائی، **یہ بچی کس کی ہے**، سین نمبر 5، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر، فرزند منو بھائی، ص9-

5 منو بھائی، **آدھے چہرے**، سین نمبر 10، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص53-

6 منو بھائی، **پتھر**، سین نمبر 1، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکا کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص6-

7 منو بھائی، **چھوٹے**، قسط نمبر 7، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص6-

8 منو بھائی، **حوالدار کا ہوٹل**، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، سین نمبر 05، ص9-

9 منو بھائی، **مسرت**، سین نمبر 3، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص9-

10 منو بھائی، **نغمے کا سفر**، سین نمبر 9، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص18-

11 منو بھائی، **دوسرا قدم**، سین نمبر 4، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص19-

12 منو بھائی، **خاموش**، قسط نمبر 4، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص22-

13 منو بھائی، **رونمائی**، سین نمبر 4، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص9-

14 منو بھائی، **سرخ ندی کے موڑ پر**، سین نمبر 1، مخزونہ ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی، مملوکہ کاشف منیر فرزند منو بھائی، ص66-